مولانا محمد جعفر پھلواروی

ایک حدیث (اثر)

غنی اور بادشاہ کون ہے؟

قال له [ای لعبد اللہ بن عمرو بن العاص] رجل: ألسنا من فقراء المهاجرين؟ فقال: ألك امرأة تأوي إليها؟ قال: نعم۔ قال: ألك مسكن تسكنه؟ قال: نعم۔ قال: فأنت من الأغنياء۔ قال: فإن لي خادمًا۔ قال: فأنت من الملوك۔ (رواہ مسلم عن ابن عمرو بن العاص)

ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے پوچھا کہ: کیا ہم لوگ فقرائے مہاجرین میں نہیں؟ آپ نے پوچھا: کیا تمھاری کوئی بیوی ہے جس کے پاس جا کر تم سکون حاصل کرتے ہو؟ کہا: ہاں۔ پھر پوچھا: کیا تمھارا کوئی گھر بھی ہے، جہاں تمھاری سکونت ہے؟ کہا: ہاں۔ حضرت ابن عمروؓ نے فرمایا: پھر تو تمھارا شمار امیروں میں ہے۔ اس نے کہا: میرے پاس ایک خادم بھی ہے۔ آپؓ نے کہا: پھر تو تم ایک بادشاہ ہو۔

یہ ارشاد نبویؐ یعنی حدیث نہیں بلکہ اثر یعنی قول صحابی ہے۔ اثر کو ذخیرۂ احادیث میں شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے متعلق گمان غالب یہی ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ مضمون آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے سنا ہوگا۔ صحابہ ہر بات حضورؐ سے سن کر ہی نہیں فرماتے تھے، ہزاروں باتیں ان کی اپنی بھی ہوتی تھیں لیکن بعض مضامین ہی ایسے ہوتے ہیں جہاں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہوتی کہ اس کے الفاظ زبان رسالت سے نکلے ہیں لیکن وہ مضمون اندر سے خود بول اٹھتا ہے کہ یہ تعلیم نبوی ہی کی عکاسی ہے اور محض اپنے دل کی گھڑی ہوئی بات نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا شمار ان اجلّۂ صحابہ میں ہے جنھوں نے تعلیمات نبوی کو اپنی روح میں جذب کر لیا تھا۔ حضرت عبداللہ اور ان کے والد سیدنا عمروؓ ابن العاص کے مذاق و مزاج میں تقریباً ویسا ہی فرق تھا جیسا حضرت عبداللہ اور ان کے پدر بزرگوار سیدنا عمر بن خطاب کے ذوق میں تھا۔ ادھر ہوذری فقر و درویشی کا غلبہ اور ادھر درویشانہ جہانبانی کا نمونہ۔

اس روایت میں پس منظر موجود نہیں اور بیشتر روایات ایسی ہیں جن کا پس منظر موجود نہیں لیکن عموماً واضح قرینے سے اسے سمجھ لیا جاتا ہے۔ پیش نظر روایت میں کوئی ایسا واضح قرینہ نہیں جس سے اس کا پس منظر معلوم کر لیا جائے کہ آخر سوال کرنے والے نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے یہ سوال کیوں کیا؟ کہ: کیا ہم فقرائے مہاجرین میں سے نہیں؟ معلوم

ایسا ہوتا ہے کہ دریافت کرنے والا اپنے آپ کو کسی حصہ مال کا حق دار سمجھتا تھا اور وہ مال ایسا تھا جس میں فقرائے مہاجرین کا قرآن نے حصہ رکھا ہے۔ مثلاً مال فَے۔ یا ممکن ہے وہ شخص کچھ معاشی تنگی محسوس کرتا ہو اور اپنے لیے بیت المال وغیرہ سے اعانت کا خواہش مند ہو۔

بہرحال کوئی سا بھی پس منظر ہو، ایک بات تو واضح ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی طرح کچھ اور مہاجرین کو بھی محتاج سمجھ رہا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عمرو اسے اس احساسِ محتاجی کی پستی سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ اس کے اندر قناعت و استغنا کا وہ تصور پیدا فرما رہے ہیں جو اس کی ذہنیت کو بدل کر بادشاہوں سے بھی زیادہ بے نیاز بنا دے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ وہ شخص جناب ابن عمروؓ کے سوال کے جواب میں اپنی کل کائنات کیا بتاتا ہے؟ ایک بیوی اور ایک مسکن۔ اتنی مختصر سی کائنات کا حال سن کر سیدنا ابن عمرو اسے یہ بتاتے ہیں کہ ان دو چیزوں کے ہوتے ہوئے تم فقیر کس طرح ہوئے؟ تم تو غنی ہو۔ پھر جب وہ بتاتا ہے کہ: میرے پاس ایک خادم بھی ہے تو آپؓ فرماتے ہیں کہ: پھر تو تم صرف غنی ہی نہیں بادشاہ بھی ہو۔

یہاں چند نکتے قابلِ غور ہیں:

۱۔ انسانی ضرورتیں صرف بیوی اور مکان ہی نہیں۔ روٹی، کپڑا۔ (اور موجودہ دور میں تعلیم، علاج اور تفریحات) بھی ضروریاتِ زندگی میں داخل ہیں، لیکن یہاں صرف دو ہی چیزوں کا ذکر ہے جن کی وجہ سے سائل غنی قرار دیا جا رہا ہے۔ رفیقۂ زندگی اور مکان۔

غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ روٹی کپڑے سے اس وقت کوئی بھی تنگ نہ تھا۔ سب کو بقدر ضرورت بیت المال سے وظائف مل جاتے تھے۔ رہا مکان منقولہ شکل میں، یعنی بصورتِ خیمہ تو عام طور پر اس سے کوئی محروم نہ تھا۔ البتہ غیر منقولہ شکل کا مکان جس کے پاس بھی تھا وہ خوش حال سمجھا جاتا تھا۔ حضرت ابن عمروؓ کا مقصد "مسکن" سے یہی ہوگا جو غنا یا خوش حالی کا نشان تھا، کم از کم حضرت ابن عمروؓ کی نگاہ میں۔

۲۔ جو شخص روٹی، کپڑے اور مکان سے بے فکر ہو اسے غنی تصور کیا جاتا ہے لیکن سیدنا عبداللہ بن عمرو صرف انہی چیزوں کو خوش حالی نہیں تصور کرتے بلکہ مکان سے پہلے یہ دریافت فرماتے ہیں کہ تمھاری بیوی بھی ہے یا نہیں؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو آپ فروری ۱۹۷۵ء کے "المعارف" میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ایک شخص مال دار اور دولت مند ہونے کے باوجود آنحضورؐ کی نگاہ میں مسکین ہے اگر

ہ بے زوج ہے۔ یہی مضمون ہے جو سیدنا ابن عمرؓ دہرا رہے ہیں۔ یعنی اگر تمھاری بیوی موجود ہے تو تمھاری آدھی مسکنت تو ختم ہو چکی اور دوسری نصف مسکنت کو مکان کی موجودگی نے ختم کر دیا۔ لہٰذا تمھارا شمار اب فقرائے مہاجرین میں نہیں، بلکہ اغنیائے مہاجرین میں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے جتنے فطری تقاضے ہیں ان میں ازدواج محض ایک جنسی تقاضا ہی نہیں، بلکہ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہ ایک ایمانی، اخلاقی اور معاشرتی تقاضا بھی ہے۔ اور جو ایسے اہم فطری تقاضے کی تکمیل سے محروم ہے اسے مال و دولت رکھنے کے باوجود مسکین قرار دینا ہر لحاظ سے صحیح ہے اور جو اس مسکنت کو دُور کر چکا ہے اس کا شمار اغنیا میں ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔

۳۔ جناب عبداللہ بن عمرؓ جیسے زاہد کی نظر کتنی بلند تھی اور آپ کا معاشی تصوّر کتنا قناعت و استغنا سے بھرپور تھا۔ اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ صرف دو چیزیں — بیت اور اہلِ بیت یعنی اہلِ خانہ — رکھنے والے کو آپؓ اغنیا میں شمار کرتے ہیں اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خادم بھی موجود ہے تو آپؓ اسے صرف امیر ہی نہیں بلکہ بادشاہ تصور کرتے ہیں۔ اس سے ایک تو جناب عبداللہ کی قناعت پسندی، بے ہوسی، اور زہد و اتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ دوسرے پتا چلتا ہے کہ آپؓ کا مزاج سنتِ نبوی میں کس درجے قریب تھا۔ حضورؐ کا جو معیارِ زندگی تھا جناب عبداللہ بھی اسی معیار کو کافی سمجھتے ہیں اور جس طرح حضورؐ نے بے زوج زندگی کو مسکنت زندگی قرار دیا اسی طرح جناب ابنِ عمرؓ بھی بے زوجی کو مسکنت اور بازوجی کو غنا قرار دیتے ہیں۔

۴۔ یہ واقعہ ہے کہ انسان کی وہ بنیادی ضرورتیں جو جسم و جان کے اتصال کو باقی رکھنے کے لیے لازمی ہیں ان میں خورد و نوش پہلی چیز ہے۔ دوسری چیز لباس ہے، جس کو اگر ستر پوشی اور زینتِ بدن سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو جسم کو موسمی اثرات سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ پھر جسم و جان کو محفوظ رکھنے کے لیے سر چھپانے کی ایک جگہ بھی ضروری ہے جسے مکان یا مسکن کہتے ہیں اور یہ تیسری بنیادی ضرورت ہے۔ اگر اس میں دوا علاج کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ بھی ایک بنیادی ضرورت ہے کیونکہ اس سے روح و بدن کا اتصال قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے اور جسمانی اذیت کو دور کر کے سکون حاصل کیا جاتا ہے۔ انسان تختِ حکومت پر بیٹھا ہو یا فرشِ خاک پر، بنیادی ضرورتیں دونوں کو یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ معمولی آدمی موٹے جھوٹے پر گزارا

کرلیتا ہے اور دولت مند انہی چیزوں کو تکلفات کے ساتھ استعمال کرتا ہے یہیں آکر سوشل جسٹس اور معاشی عدل کا سوال پیدا ہوتا ہے یعنی دولت مند اپنے بے جا تکلفات کو ترک کرکے فاضل اخراجات کو ان حاجت مندوں کی طرف کیوں نہیں لوٹا دیتا جو بنیادی ضروریات کی تکمیل سے بھی محروم ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جب ایک بے مایہ اپنی آنکھوں سے سرمایہ داروں کے نابجا ضرورت اور مسرفانہ تکلفات و آسودگی کو دیکھتا ہے تو لازماً اس کے دل میں ویسی ہی خوش حال زندگی کی آرزوئیں چٹکی لینے لگتی ہیں اور اب تقابل کی وہ دوڑ شروع ہوجاتی ہے جسے قرآن الہٰکم التکاثر کہتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ طبقاتی کشمکش، بے چینی، فساد اور خون ریزی کی شکل میں ظاہر ہوکر رہتا ہے۔ اس تکاثر کو روکنے کی یہی شکل ہے کہ ایک طرف تو عیش پسندوں کو افراطِ عیش سے روک کر ان کے معیارِ زندگی کو ذرا پست کیا جائے اور فاضل مال کو سائل و محروم طبقے کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اور دوسری طرف بے مایہ طبقے میں ایسی قناعت و بے نیازی پیدا کی جائے کہ ان کا جذبۂ تکاثر سرد پڑ جائے اور ایسے مستغنی ہوجائیں کہ بنیادی ضروریات سے زیادہ کی ہوس ہی ختم ہوجائے۔ اساسی ضروریات سے زیادہ کی خواہش تو الگ رہی۔ اگر بلا طلب بھی آجائے تو اسے قبول کرنے سے انکار کردے یا کسی ایسے ضرورت مند تک پہنچا دے جو بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہے۔

سیّدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص سوال کرنے والے کے اندر یہی جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اسے یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ تم گدا نہیں بلکہ شاہ ہو۔ اگر تمہارا ذہن غنی ہے تو اپنی بنیادی ضروریات کے ہوتے ہوئے تم بادشاہ سے کم نہیں ہو، اور اگر ایک بادشاہ ہوس ھل من مزید میں گرفتار ہے تو یہ اس کا ذہنی افلاس ہے اور وہ فی الحقیقت گدا ہے۔ جس تکاثر سے دنیا میں فساد پیدا ہوتا ہے وہ فقط دولت مندوں کا اسراف ہی نہیں، بے مایہ کی بے جا ہوس بھی ہے۔ سیدنا ابن عمرو کا مخاطب اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اسے وہی حقیقت سمجھا رہے ہیں جس کا تعلق اس کی اپنی ذات، اپنی زندگی اور اپنے تصوّر سے ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ آپؓ ایک غریب کو محض تھپکیاں دے دے کر سُلا رہے ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر سرمایہ دار "تقدیر" کی افیونی گولی کھلا کر غریبوں کو ابھرنے سے روک دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بالکل نہیں۔ یہاں کوئی ذہنی گراوٹ نہیں پیدا کی جارہی ہے بلکہ ایسی ذہنی بلندی پیدا کی جارہی ہے جو خوشیوں سے بھرپور اور احساس کم تری سے پاک و صاف ہے۔